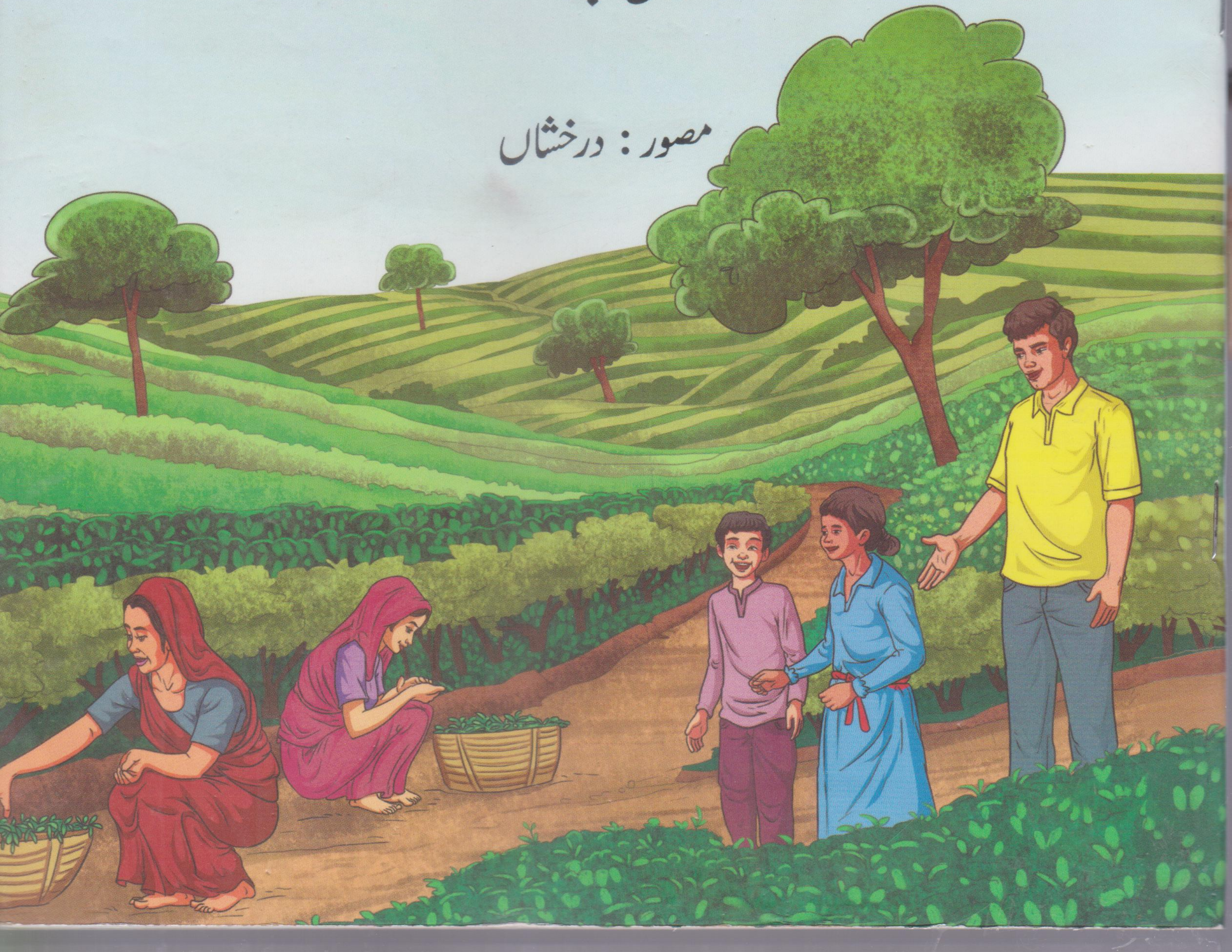
چائے بگان کا کنول

سلمان عبدالصمد

مصور : درخشاں



12 تا 18 سال کی عمر کے بچوں کے لیے

نئی نسل کی ذہنی نشوونما اور ان کے خوابوں کو پرواز عطا کرنے کے لیے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ادب اطفال کی تخلیق و تشکیل کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے نئے اشاعتی مشن اور وژن کے تحت 18 تا 20 ستمبر 2024 ادب اطفال ورکشاپ کا انعقاد کیا تھا، جس میں بچوں کی نفسیات و ترجیحات کا خیال رکھتے ہوئے معتبر تخلیق کاروں کے تعاون سے دلچسپ اور معلومات افزا تخلیقی مواد تیار کیا گیا۔ یہ کتاب اسی ورکشاپ سیریز کی ایک کڑی ہے۔



ڈاکٹر شمس اقبال
ڈائرکٹر

ISBN 978-93-49533-53-0

پہلا ایڈیشن: 2025

تعداد: 1100

CHAI BAGAN KA KANWAL
by Salman Abdus Samad

قیمت: -/40 روپے

سلسلہ مطبوعات: 2175

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔ میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔ میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65، نوئیڈا-201301، یوپی

چائے بگان کا کنول

سلمان عبد الصمد

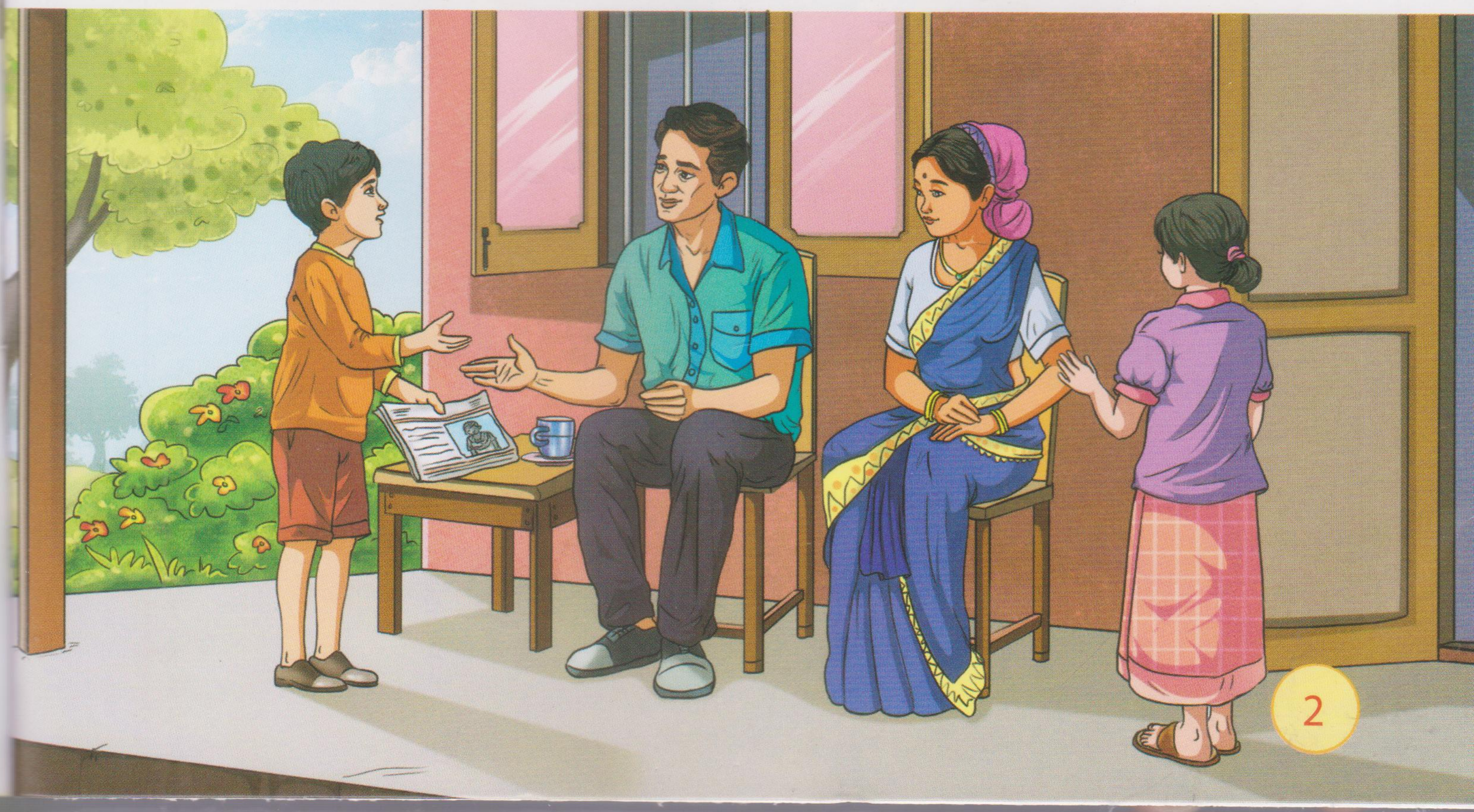
مصور: درخشاں

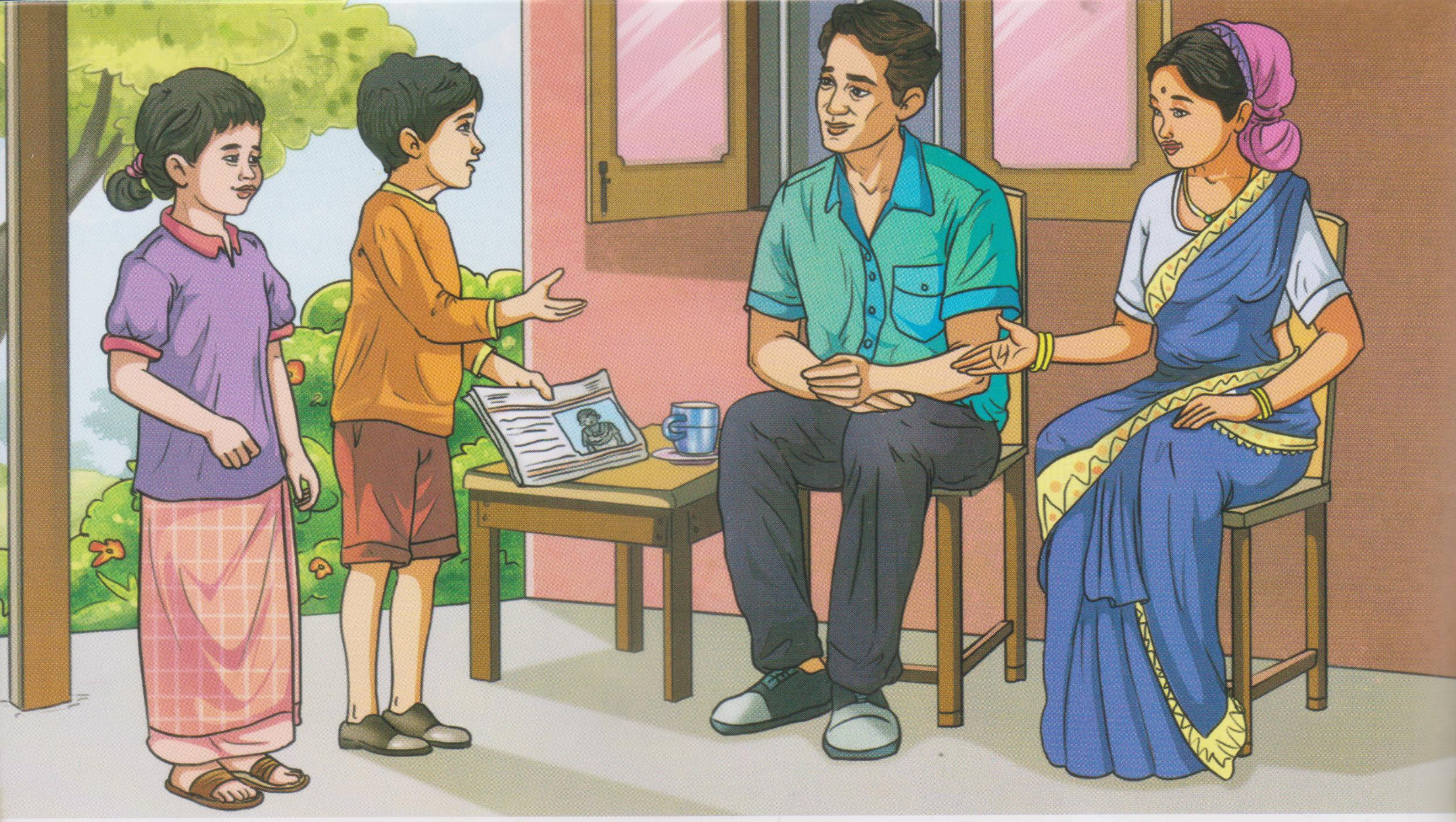


قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

”ایسی کامیابی، بڑی کامیابی ہوتی ہے مگر اتنی نہیں جتنی کہ آسام سے جڑ کر ہوگئی۔ کیوں؟“ ہاتھ میں اخبار تھامے بیٹے نے والد سے پوچھا۔ ”کوئی وجہ تو ہوگی۔“ والد نے کہا۔

”تو کیوں نہیں ہم اس کو جانیں۔“ بیٹی نے اپنی رائے دی۔ پھر وہ والد سے نظریں چرا کر والدہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ گویا ان کی اجازت ضروری ہو۔ بیٹے کی نظر ایک بار پھر اخبار کے صفحے پر جمی تھی۔ وہ اخبار میں مسکرانے والے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ گردن میں کئی ہار تھے۔ ارد گرد بہت سے رنگ برنگ پیکٹ بکھرے پڑے تھے۔ لوگوں نے اسے تحفوں سے نہلا دیا تھا۔ پھر حکومت نے اس کے لیے بڑے بڑے انعامات کا اعلان کیا تھا۔





ماں نے بیٹی کی نظر کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لیے بیٹے نے کہا: ”علیزہ ٹھیک کہتی ہے اماں، ہمیں اس خبر کو سمجھنے کے لیے سفر کرنا چاہیے۔ ویسے بھی آپ نے ہم سے کہیں سیر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔“

والدین نے بچوں کو دیکھا۔ ان کے تجسس کو محسوس کیا۔ دونوں کا ذہن بہت کچھ جان لینے کے لیے بے قرار تھا۔

”ہاں، ٹھیک ہے، چلیں گے۔ والدین نے بیک زبان کہا۔ بس وہاں کے موسم کے متعلق جان لیں۔ تمھاری چھٹیوں کا تال میل بٹھالیں۔“

”پھر ضرور چلیں گے، آسام۔ ہم اس لڑکے سے بھی ملیں گے جو اخبار میں مسکرا رہا ہے۔ اب تو خوش۔“ بیٹے کے چہرے پر محبت سے بھری اور ہوا سے ہلکی چپت لگاتے ہوئے والد نے کہا۔

دونوں خوش ہو گئے۔ ان کی عمر بارہ برس کے لپیٹے میں تھی۔ بیٹی بڑی تھی اور بیٹا اسی کی پیٹھ پر تھا۔

نومبر میں یہ ارادہ بنا اور وہ مارچ میں آسام پہنچے۔ یہاں کے راستے سانپوں کی طرح لہراتے تھے اور اونٹ کی پشت کی طرح اونچے نیچے تھے۔



اس لیے علیزہ نے پوچھا: ”پاپا، یہاں کے راستے ایسے کیوں ہیں ؟“ اس نے بڑے ہی دلکش انداز میں اپنی ہتھیلی کو ہوا میں لہرایا تھا۔

”خوب۔ آسام آنے کے بعد تمھارے دلوں میں یہ سوال ضرور پیدا ہونا چاہیے تھا۔ دیکھو بیٹی ہر علاقے کا اپنا جغرافیہ ہوتا ہے۔ اس سے وہاں کی تہذیب جڑی ہوتی ہے۔ تمھیں میں ابھی بہت ساری باتیں نہیں بتاؤں گا۔ بس ایک بات جان لو۔ تم چائے بہت پیتی ہو۔ حالانکہ بچوں کو اتنی نہیں پینی چاہیے۔ خیر، اس کی پتیاں کہاں سے آتی ہیں؟ یاد رکھو، کیرل، بنگال اور تمل ناڈو کی طرح آسام سے بھی۔ پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ پوری دنیا میں جتنی چائے پتیاں پیدا ہوتی ہیں، اس کا 22 فیصد صرف آسام سے۔ ہاں، آسام سے۔“





شکریہ پاپا۔ آپ نے بہت اچھی بات بتائی۔ ایان اور علیزہ کا شکریہ فضا میں گھل مل گیا۔ پھر ایان نے کہا: ”مگر پاپا آپ نے اوبڑ کھابڑ راستوں پر کچھ نہیں کہا۔“

”لو، ابھی بتائے دیتے ہیں۔ اونچائی پر اس طرف دیکھو، چائے بگان۔ یہ اونچائی پر کیوں ہیں؟ اس لیے کہ چائے کے پودوں کا مزاج ذرا الگ ہوتا ہے۔ ڈھائی تین فٹ کے ان پودوں کو پانی سے محبت ہے اور نفرت بھی، بلکہ ایک طرح کی دشمنی بھی۔ بارش تو ہو مگر درختوں کی جڑ میں پانی نہ لگے، یعنی پانی اوپر سے آئے اور درختوں کو نہلا کر کہیں دور نکل جائے۔ اس لیے چائے بگان اکثر ڈھلان پر ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ تم لوگ بہت کچھ جان گئے ہو گے؛ اونچائی اور گہرائی کے متعلق، چائے باغوں کے متعلق۔ ہے نا۔“



"ہاں ہاں، پاپا۔ کیوں نہیں۔ بہت کچھ سمجھ گئے۔" کار وادی میں فراٹے بھر رہی تھی۔ موسم کی خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ کہیں بارش ہو رہی تھی تو کہیں رکی تھی۔ گویا چند کوسوں میں موسم ایک جیسا نہیں تھا۔ اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ موسم کی بے ایمانی دیکھنی ہو تو نارتھ ایسٹ (شمال مشرقی) ہندوستان کا بھی سفر کرنا چاہیے۔

یہ بھی سمجھو، جب چائے کے پودے بارش میں نہاتے ہیں تو شاید انھیں ٹھنڈ لگتی ہے۔ اس لیے پانی کے بعد انھیں دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ نئے نئے پتے جلد اگ آئیں۔ سچ، بے ایمان موسم پتیوں کے لیے ایمان دار ہوتا ہے!

”پاپا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ چائے کے بگان ڈھلان پر ہوں مگر ڈھلان سے پانی اتر کر جگہ جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے، ادھر دیکھئے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ نیچے اترے ہوئے پانی ہیں یہ۔“ بیٹے نے پوچھا۔

”بہت اچھا سوال۔ پانی کا جمع ہونا بھی ایک جغرافیائی پہلو رکھتا ہے۔ آسامی مچھلی شوق سے کھاتے ہیں۔ قدرت کا نظام دیکھو؛ اونچائی پر پتی اور گہرائی میں مچھلی۔“ والد نے جواب دیا۔

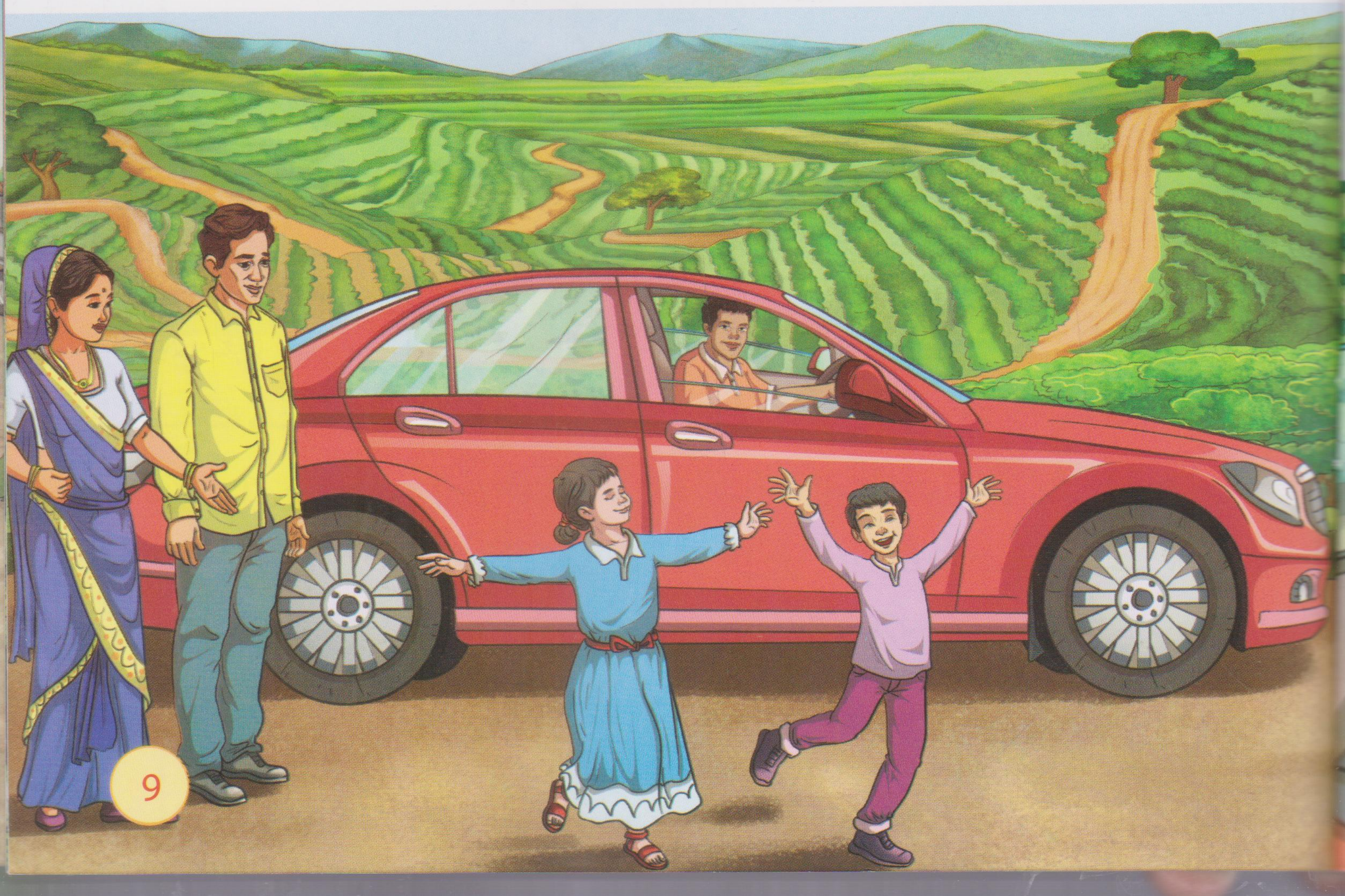
نئی نئی باتیں سن کر بچے خوشی سے جھوم اٹھے۔ اتنے میں ڈرائیور نے کہا کہ اس بچے کا گاؤں قریب ہے جس سے آپ لوگوں کو ملنے کا شوق ہے۔ یہ سن کر بچے اور زیادہ خوش ہو گئے۔ تالیاں پیٹنے لگے۔

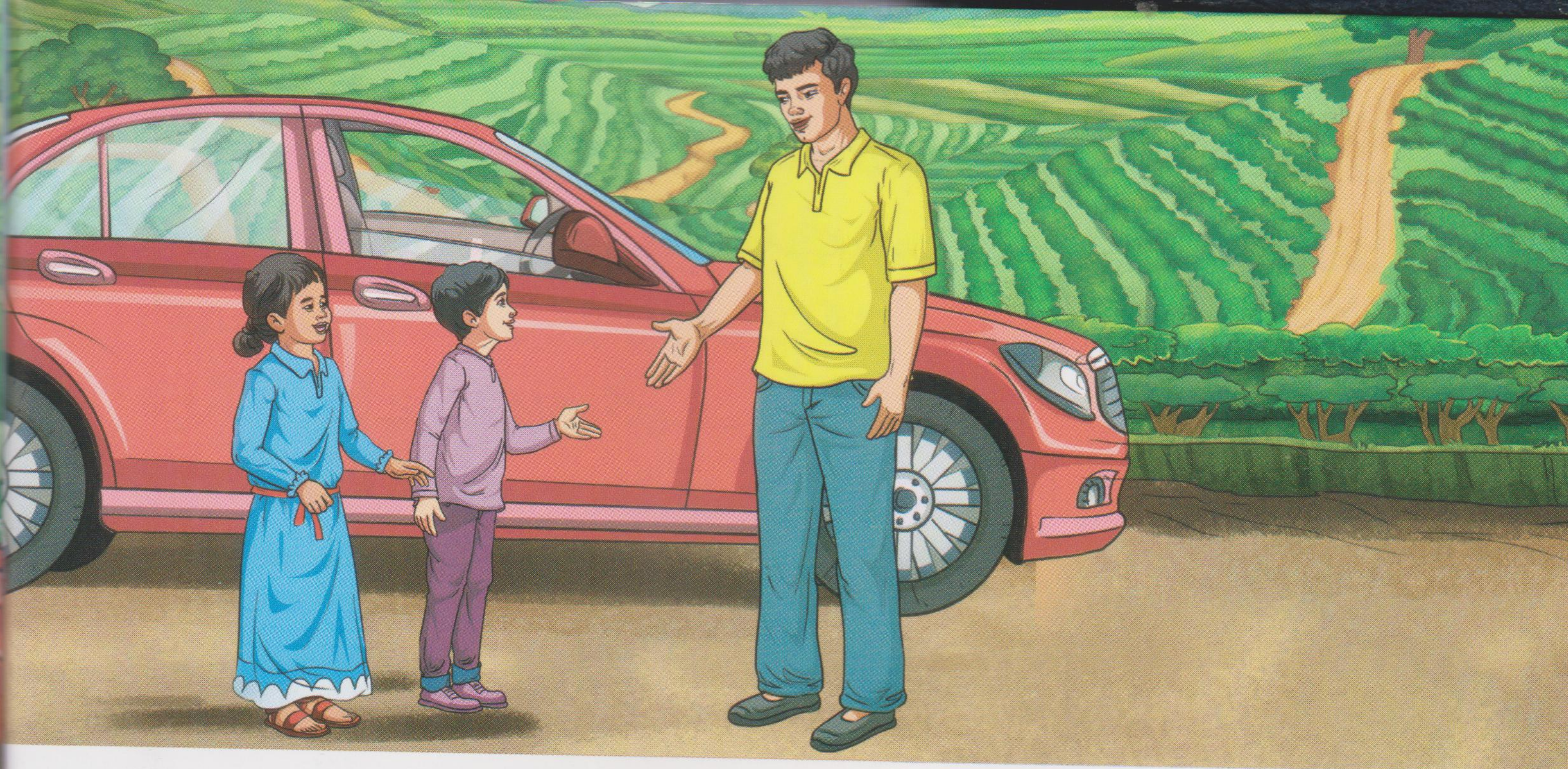
ڈرائیور سے اس گاؤں کے کچھ فاصلے پر گاڑی روک لینے کو کہا گیا تھا تاکہ وہ لوگ کچھ تحفے خرید سکیں اور لوگوں سے بات چیت بھی کر لیں۔



بچے کار سے اتر کر مستی کرنے اور موسم کا لطف لینے لگے۔ دونوں نے بانہیں پھیلا دیں۔ آنکھیں بند کر کے انھوں نے چہرے کو آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ پھر وہ لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگے۔ سانسوں میں پتی کی مہک سمانے لگی۔ انھیں اس قدر خوش دیکھ کر والدین دل ہی دل میں کہنے لگے ”پیسہ وصول، سفر کامیاب۔“ اسی درمیان علیزہ نے ضد کی کہ ہم پہلے سامنے والے باغ میں چلیں گے۔

والدین راضی ہو گئے۔ آسامی ڈرائیور ساتھ تھے۔ وہ بچوں کے تجسس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنی بات رکھی۔



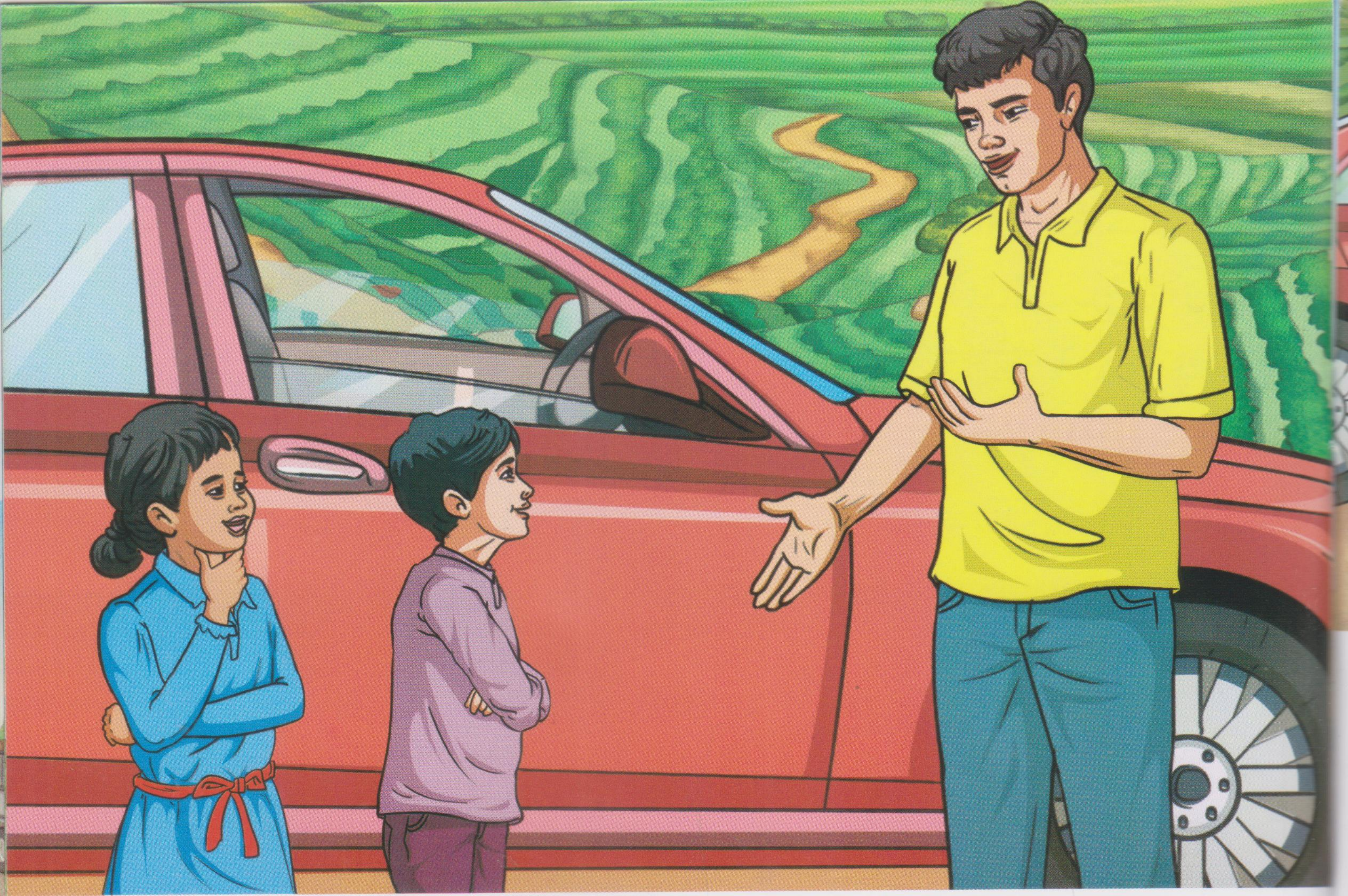


سنو بچو!

"ہر ملک میں چائے کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ آج بس چین کی کہانی۔۔۔! کیا آپ سنیں گے۔" ڈرائیور نے بچوں کا شوق جگایا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں انکل۔" ان کے شور سے باغ گونجنے لگا۔

"سنیے۔ بہت زمانے پہلے کی بات ہے۔ ایک بادشاہ تھا۔ نام شین ننگ تھا۔ وہ سیر کو نکلا۔ جیسا کہ آپ لوگ یہاں سیر کو آئے ہیں۔ اس دوران ایک بڑی ٹیم اس کے ساتھ تھی۔ تھک کر وہ ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لگا۔ اس کا غلام اس کے لیے پانی گرم کرنے میں لگ گیا۔ چونکہ ہوا تیز چل رہی تھی اس لیے غلام نے آڑ کے لیے مناسب جگہ تلاش کی۔ تین چار فٹ اونچے پودوں کے اوٹ میں آگ جلا کر وہ پانی گرم کرنے لگا۔ اڑتے اڑتے چند پتے پانی میں آگرے۔۔۔!



آپ لوگ نہیں سن رہے ہیں۔ شاید مزہ نہیں آرہا ہے؟"

"نہیں ڈرائیور انکل، ہم تو پورے دھیان سے سن رہے ہیں۔ آگے سنائیے۔"

"ہاں تو، بادشاہ نے دور سے پتوں کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ غلام پانی بدلنے لگا تو اس نے اسے پانی کے ساتھ بلایا۔ بادشاہ نے پانی کو سونگھا۔ چکھا۔ پھر ایک گھونٹ پی بھی لیا۔ اسے پسند آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس طرح چائے کی شروعات ہوئی۔ کچھ لوگ ایسا کہتے ہیں۔"

قصہ سنتے سناتے وہ سب بگان پہنچے۔ چند عورتیں پودوں کے بیچ جھکی ہوئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر علیزہ مسرور ہو گئی۔ پھر کہنے لگی:

"انکل انکل، کہیں ان جیسے پودوں کے پتے بادشاہ کے پانی میں گرے تو نہیں تھے۔"

یہ سن کر سب کے چہرے پر مسکان پھیل گئی اور بچے عورتوں سے قریب ہو کر باتیں کرنے لگے۔



”آنٹی ہم آپ کو چین کی کہانی سنائیں گے۔ اس کے بدلے آپ اپنی کہانی سنائیے نا۔“

نزاکت سے جھکی ہوئی عورتوں کی کمر پر ڈولچی تھی۔ سر پر گول بلکہ ہاتھی کے کان جیسے بانس کے ٹوپ تھے۔ ہاتھوں میں چستی تھی۔ پتے توڑ توڑ کر وہ ڈولچیوں میں رکھتی جا رہی تھیں۔ پچھلے تین گھنٹوں سے یہ عمل جاری تھا۔

”بچے ابھی ذرا رکو۔ مجھے پچیس کلو پتیاں توڑنی ہے۔ ورنہ آج کی مزدوری نہیں مل پائے گی۔ ذرا تھم جاؤ۔ سب کچھ بتاؤں گی۔“

پودوں کے بیچ میں انھوں نے تھوڑی سی خالی جگہ پالی اور وہ وہیں بیٹھ گئے۔ گویا وہ کسی ہرے کنویں میں ڈوب گئے ہوں۔ بچوں نے والد سے موبائل لیا اور یوٹیوب میں ”آسام کی پتی“ لکھ کر سرچ کیا۔





سب اس ویڈیو کو دیکھنے لگے۔ حالانکہ علیزہ کا ذہن عورت سے بات کرنے کی طرف لگا ہوا تھا۔ ایان لڑکے سے ملنے کو بیتاب تھا۔ خیر، وہ سب ویڈیو کو غور سے دیکھنے سننے لگے۔ سوچنے اور غور و فکر کرنے لگے۔

چند تصاویر کمپنی کے اندر کی تھیں۔ ویڈیو روک کر علیزہ نے کہا کہ ہم یہاں سے کمپنی چلیں گے۔ پھر اس نے ویڈیو کو آگے دیکھنا شروع کیا۔ اس طرح ان لوگوں نے کئی ویڈیو دیکھ لیے۔



25 کلو پتیاں توڑنے کے بعد وہ بچوں کے پاس آئی۔ اپنا ٹوپ (چوپی) اتارا جو اسے خوب صورت بنا رہا تھا۔ ڈولچی کمر سے اتر گئی تھی۔ بھاری بھر کم ڈولچی سے اس کا بدن بھرا بھرا سا لگتا تھا جو اب بالکل ڈوبا ڈوبا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ٹوپ اور ڈولچی کے ساتھ زیادہ پر کشش لگ رہی تھی۔

بچوں نے ان سے زیادہ کچھ نہیں پوچھا۔ کیونکہ ابھی انھوں نے ویڈیو سے بہت ساری معلومات حاصل کرلی تھیں۔ پھر کمپنی گھوم آنے کا شوق انھیں بیتاب کیے دے رہا تھا۔

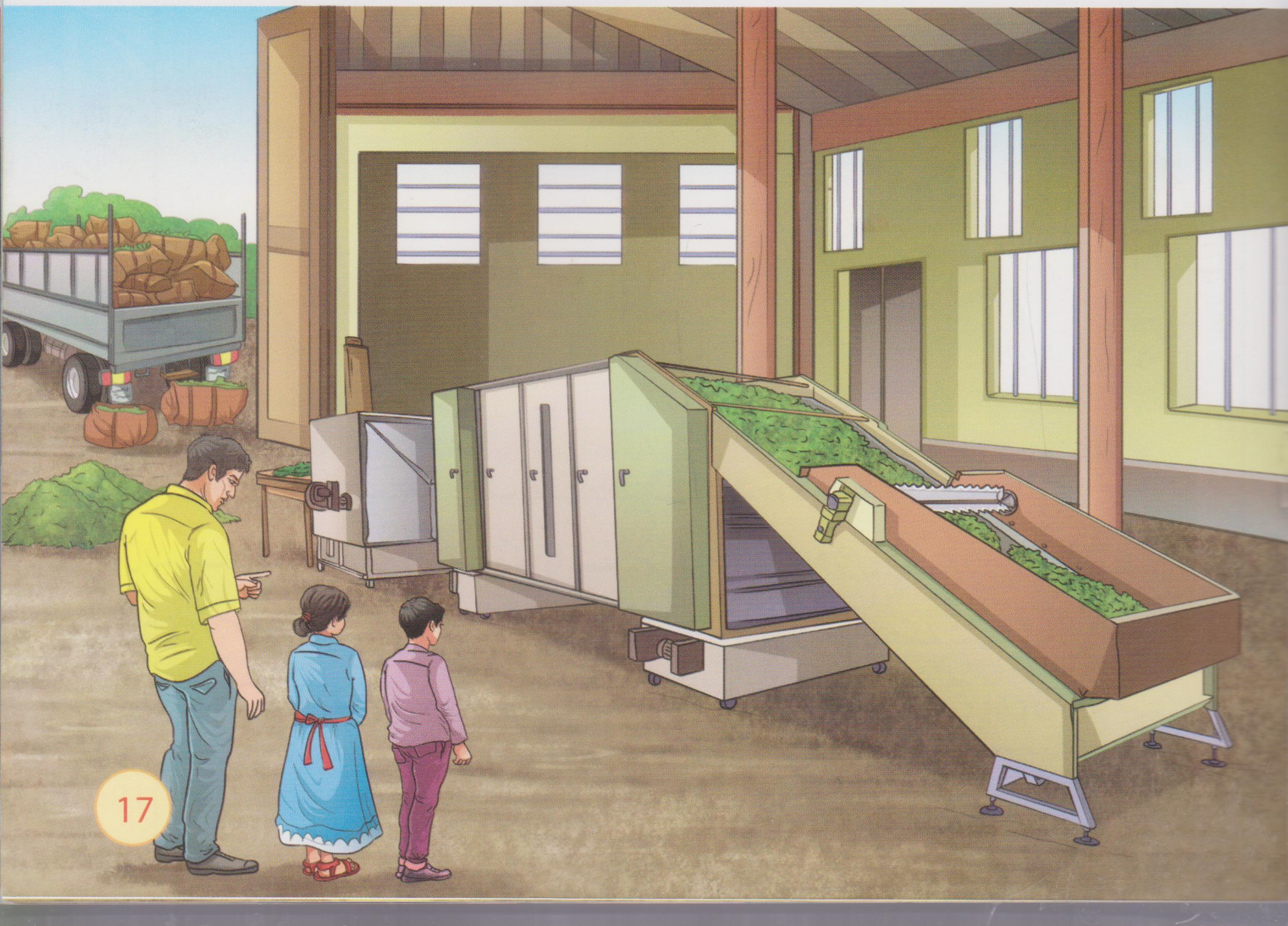
عورت نے بچوں کو پچکارہ۔ پیار کیا۔ ممتا کا اظہار کیا۔ پھر بڑی لجاجت سے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اس دلکش رویے پر بچوں سمیت سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایان عورت کے چہرے میں ڈوب کر اس لڑکے کی تصویر ڈھونڈنے لگا جس سے اخبار میں ملاقات ہوئی تھی۔

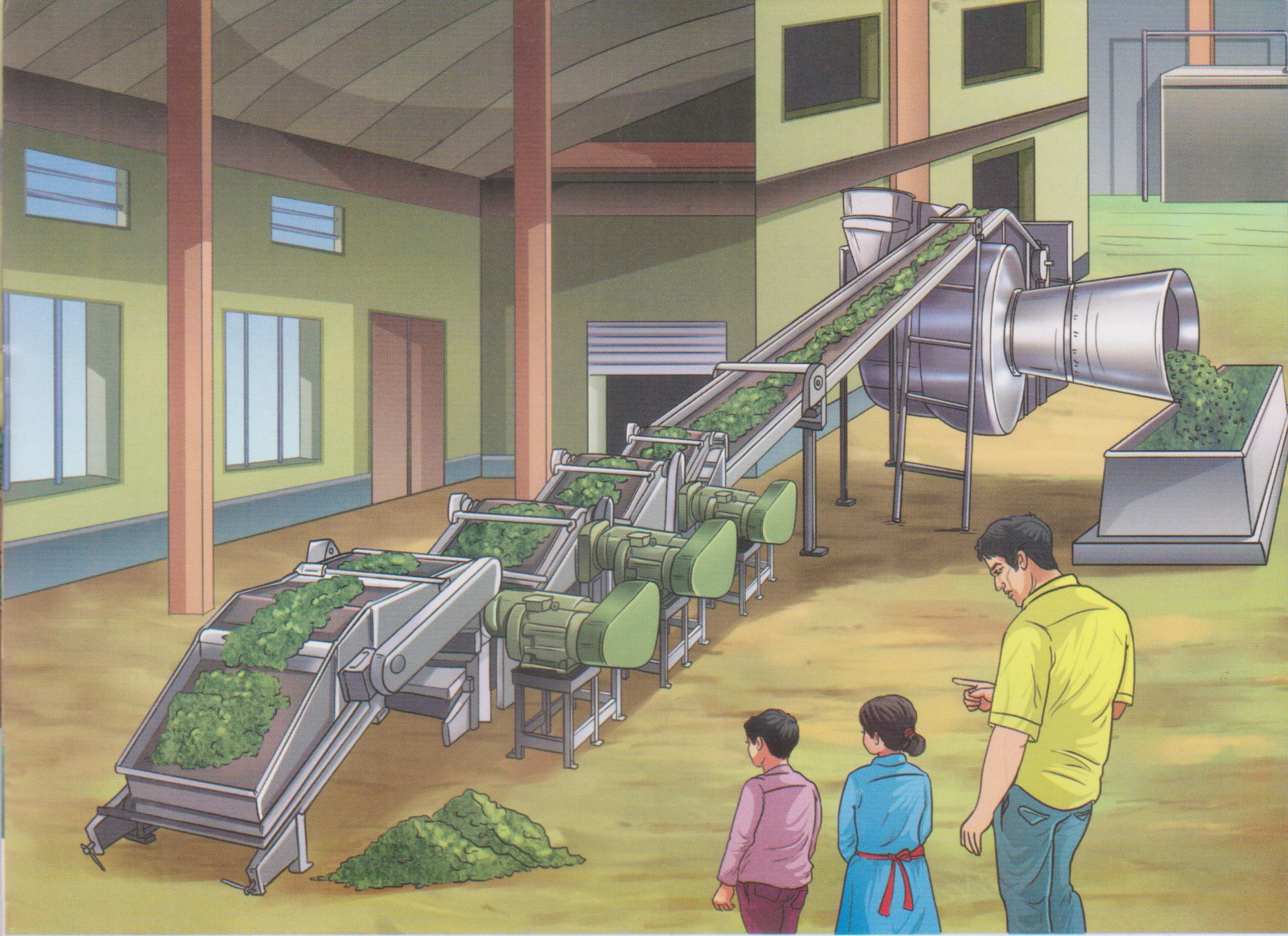
انھوں نے عورت کی دعوت قبول کرلی، اس شرط پر کہ وہ پہلے کمپنی گھومنے جائیں گے۔



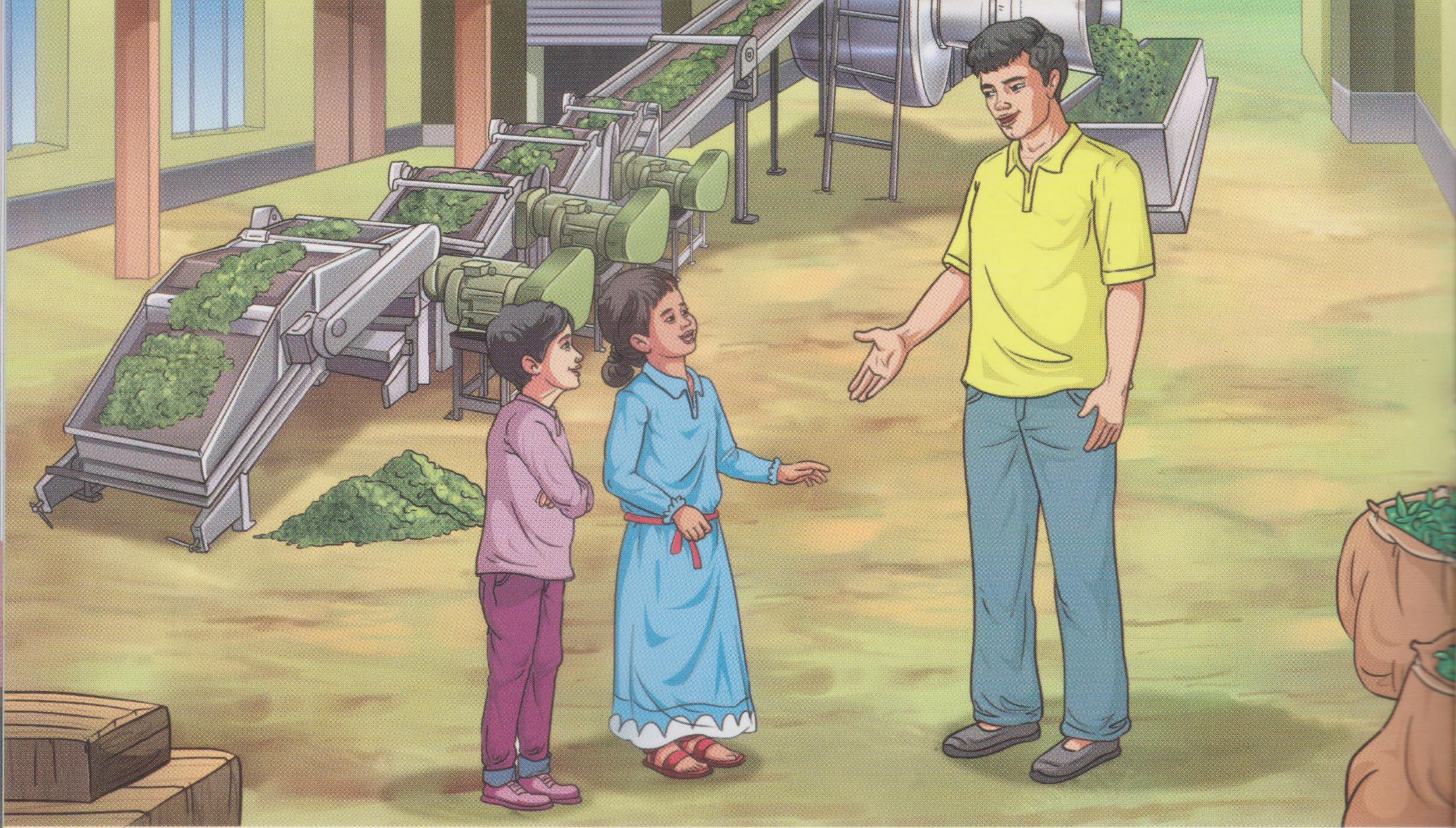
جب وہ اونچے نیچے راستوں سے گزر کر کمپنی پہنچے تو دیکھا کہ ایک ٹرک کھڑا تھا۔ جس میں بگان سے توڑی ہوئی پتیوں کی گٹھریاں بھری تھیں۔ ایک ایک کر کے گٹھریاں کشادہ جالیوں پر پھیلا دی گئیں اور ڈرائر (سکھانے کی مشین) سے تیز ہوا دی جا رہی تھی تا کہ پتیوں کا گیلا پن دور ہو جائے۔ پتیاں باغ میں کھلی کھلی تھیں مگر اب اس کی حالت بدلنے لگی۔ شاید وہ کٹنے سے پہلے ڈری ہوں۔

ڈرائیور انکل سب کو سمجھا رہے تھے۔ باریکی سے ہر بات بتا رہے تھے۔





ہوا کھانے اور مرجھانے کے بعد آٹو میٹک چوڑی بیلٹ کے ذریعے وہ پتیاں کٹر (کاٹنے والی) مشین میں پہنچ گئیں۔ باریک کٹنے کے بعد وہ چوڑی بیلٹ کے سہارے تیسرے مرحلے میں پہنچیں جہاں 100 ڈگری تپش سے کٹی ہوئی پتیوں کو سکھایا جارہا تھا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں ہری پتیاں اپنا رنگ بدل کر کالی ہونے لگیں۔ ہلتی ہوئی چلنیوں پر پتیاں گر رہی تھیں اور اپنے اپنے سائز کے اعتبار سے مختلف برتنوں میں پہنچ جاتی تھیں۔ گویا ان کی اپنی قسمت!



اسی درمیان علیزہ نے کہا:

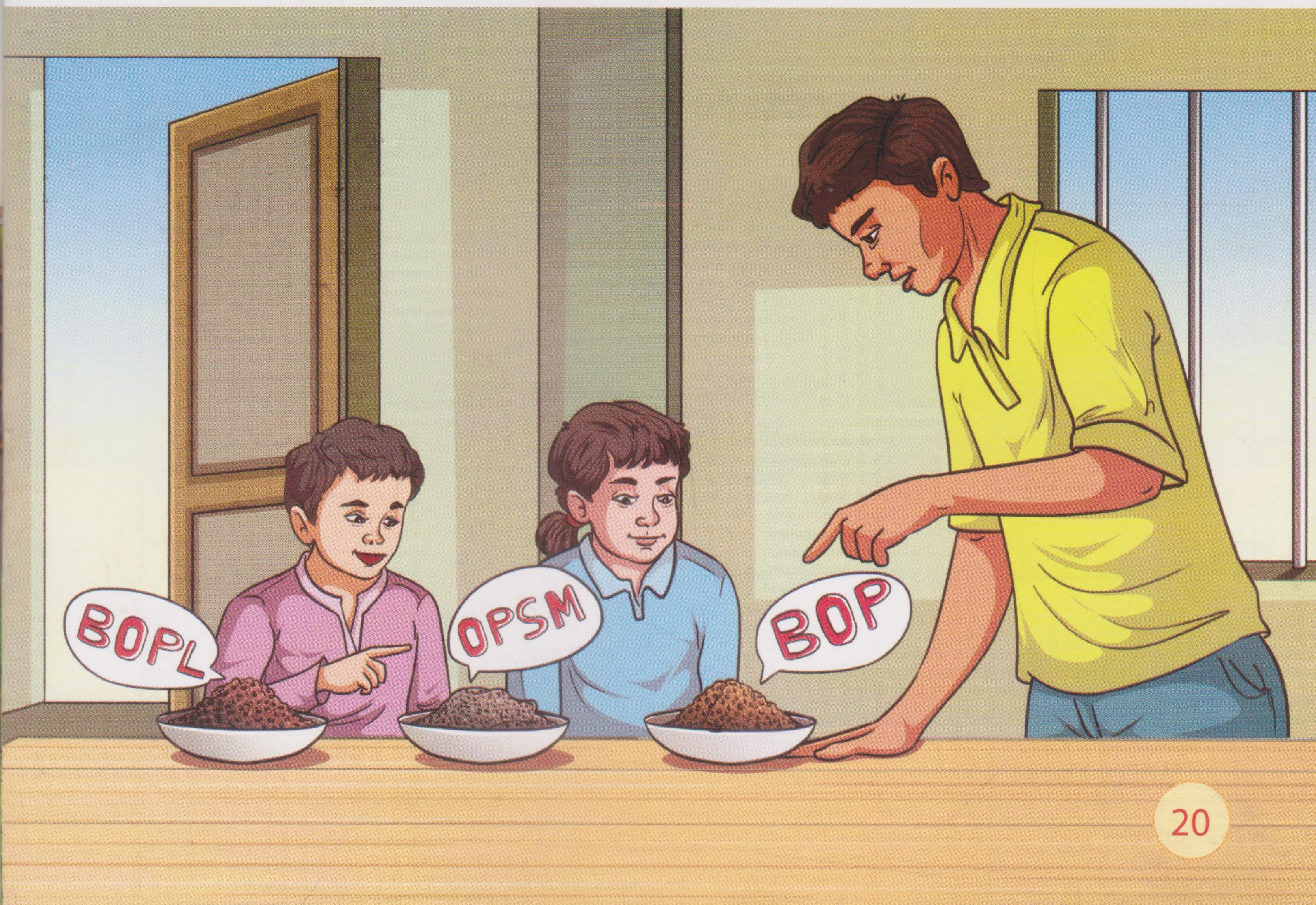
”ڈرائیور انکل میں سوچتی تھی کہ چائے کی پتی درختوں یا پودوں سے اتاری جاتی ہے۔ جس طرح سرسوں کے دانے ہوتے ہیں، اسی طرح پتیاں تیار ہوتی ہوں گی مگر ان تمام مرحلوں سے اب مجھے پتی بننے کا علم ہوا ہے۔ بہت شکریہ، انکل۔“

”اب آگے چلیئے۔“ڈرائیور مسکرائے اور پھر کہنے لگے:

”پتیاں کب تیار ہوتی ہیں؟ جب کٹتی ہیں۔ کچلی جاتی ہیں اور سخت گرمی برداشت کرتی ہیں۔ اسی طرح ہم زندگی میں پستے اور کٹتے ہیں۔ تپتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر ہم تیار ہوتے ہیں۔

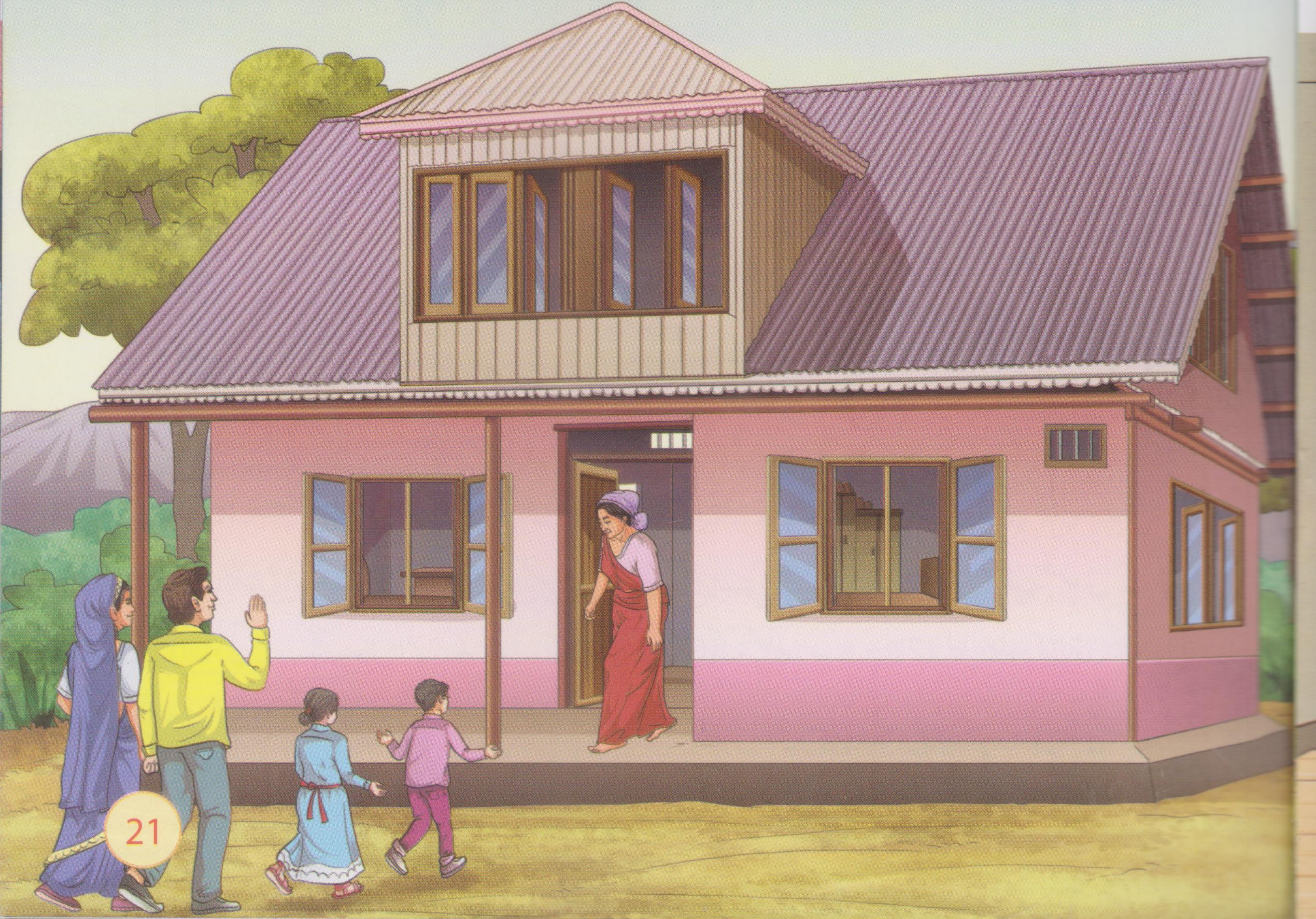
چلیے اب الگ الگ جمع ہونے والی ان پتیوں کے نام جانتے ہیں:

یہ ہے، بی پی ایس ایم۔ اس کا نام بی او پی (لال چائے کے لیے اہم) ہے۔ اسے دیکھئے، اسے کہتے ہیں بی او پی ایس ایم (میڈیم، ریگولر استعمال ہوتی ہے)۔ اس کو پہچانیے، بی او پی ایل (بڑے سائز کی پتی)۔ اوایف بھی مشہور ہے، کڑک چائے کے لیے۔" ڈرائیور انکل نے ایک مکمل گائڈ کا کام کیا۔ سب کو اچھی طرح سمجھایا۔ "اب ہمیں یہاں زیادہ نہیں رکنا چاہیے۔ آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی۔ چلیۓ۔۔۔"



رم جھم بارش میں یہ قافلہ آنٹی کے گھر پہنچا تو انھوں نے خاص آسامی گمچھا گلے میں ڈال کر سب کا استقبال کیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے دو روم تھے۔ ٹین کا چھپر تھا۔

یہاں جو پختہ عمارتیں بنتی تھیں، ان عمارتوں کی اوپری منزل میں ٹین شیڈ جیسی نالیاں بنائی جاتیں تھیں، تاکہ بارش کا پانی بہ آسانی نیچے اتر آئے۔ اسی طرح کشمیر میں عموماً ٹین شیڈ جیسی چھت بنائی جاتی ہے، کہ برف باری میں زیادہ دیر تک چھت پر برف جمی نہ رہے۔





بارش کی بوندیں ٹین کی چھتوں سے ٹکرا رہی تھیں جس سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ آنٹی نے بانس کی کھپچیوں سے بنی ایک چٹائی پر مٹ میلی چادر بچھادی اور بڑی بڑی تھالیوں میں چاول نکالا۔ تھالی کے بیچ میں چاول ٹیلے کی طرح جما تھا۔ اس کے ارد گرد لیمو کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ اس علاقے میں مختلف قسموں کے لیمو کی پیداوار ہوتی ہے۔ پھر یہاں اس کے نچوڑنے کا چلن نہیں تھا بلکہ چھلکے سمیت چبانا تہذیبی پہلو رکھتا تھا۔ پکی ہوئی چھوٹی بڑی مچھلیاں تھیں۔

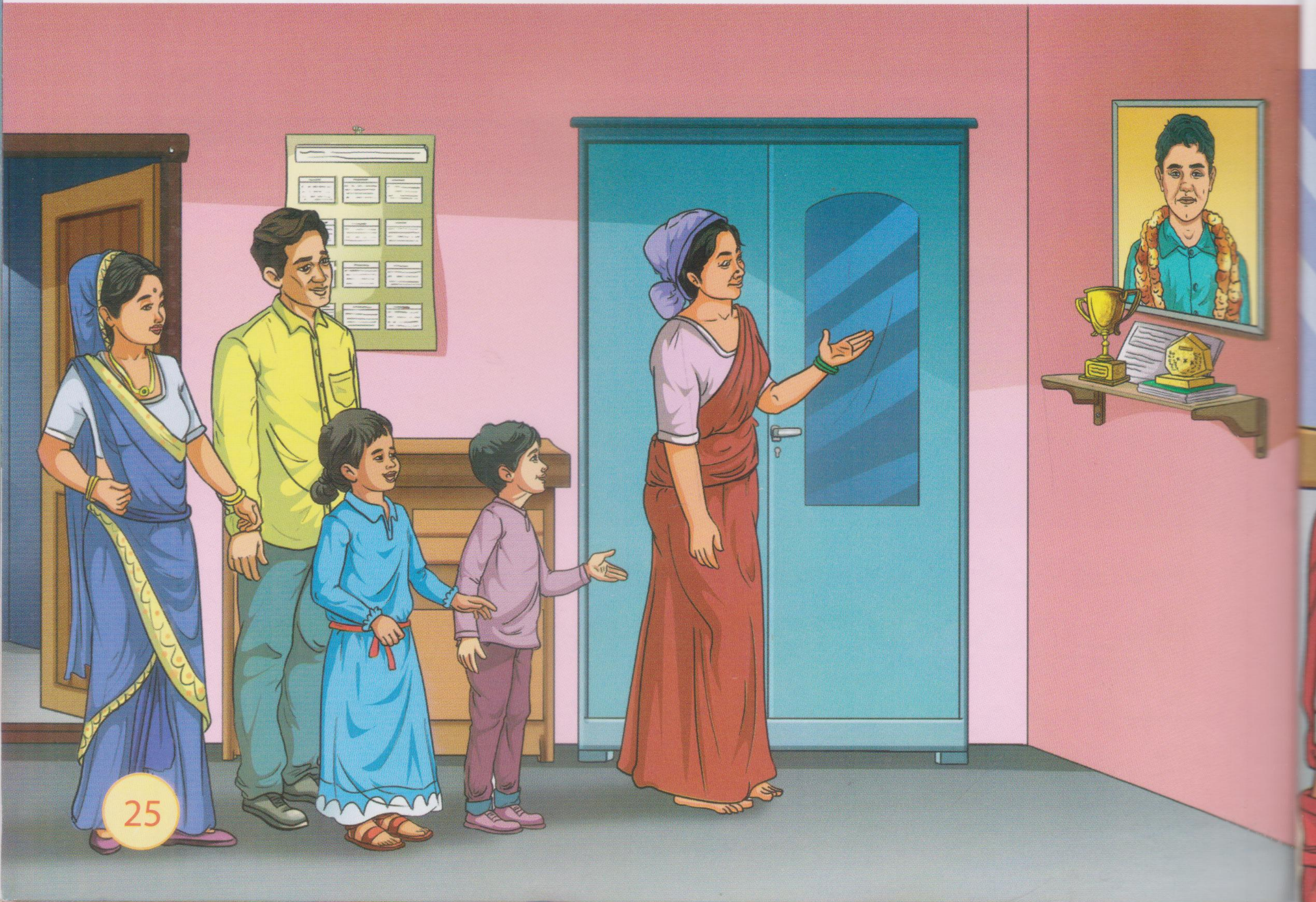


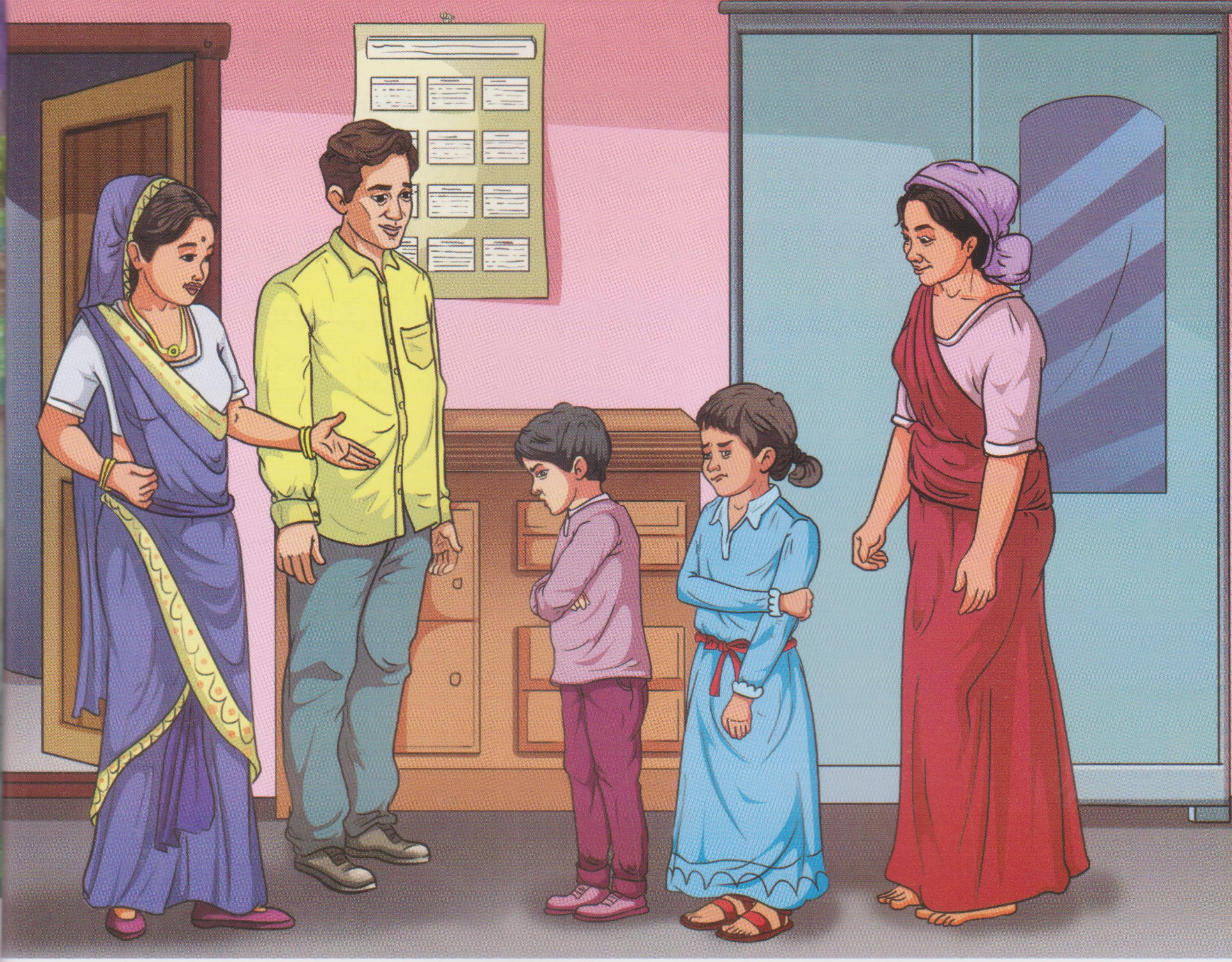
ساتھ ہی بانس (کونپل /کَرول) کی سبزی تھی، اور (پالوئی) ساگ بھی۔ ڈرائیور کے علاوہ دیگر افراد کھانا کھانے سے کہیں زیادہ کھانے کو گھور رہے تھے۔ اس دوران بچوں نے بہت سے سوالات کیے۔ بچوں نے آنٹی سے جی بھر کر بات کی۔ انھوں نے بتایا کہ تقریباً سال میں تین چار دفعہ بگان میں نئے پتے زیادہ آتے ہیں اور وہ ان نئے پتوں کو توڑتے ہیں جن سے چائے پتی تیار ہوتی ہیں۔

باتوں باتوں میں بچوں نے اس لڑکے کا تذکرہ کیا جس کے مکان کے متعلق گمان تھا کہ وہ آس پاس ہے۔ آنٹی بچوں کی باتیں چاؤ سے سنتی رہیں۔ کیونکہ وہ اس لڑکے کا تذکرہ والہانہ انداز میں کر رہے تھے۔ پھر انھیں اس سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ اسی درمیان آنٹی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ بچے حیران تھے۔ انھوں نے رونے کی وجہ پوچھی۔ آنٹی نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہ لڑکا ان کا ہی ہے۔ رات دن ایک کر کے اس نے پڑھائی کی۔ بگان اور آس پاس کی چائے کمپنیوں میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے بچے نے آج تک بارہویں جماعت میں ضلع سطح پر ٹاپ نہیں کیا۔ میرے لڑکے کو اتنی بڑی کامیابی ملی۔



بات کرتے کرتے آنٹی مہمانوں کو دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ دیوار پر وہی تصویر فریم میں لٹکی تھی جو ان بچوں نے چندماہ قبل دیکھی تھی۔ انٹر میں اتنی بڑی کامیابی کے بعد لوگوں نے اسے بہت سے تحفے دیے تھے۔ علاقے میں جشن کاماحول تھا۔ کیونکہ بگان میں ایک کنول کھلا تھا۔ ضلع سطح کی یہ کامیابی گویاملکی سطح کی کامیابی تھی۔ کیونکہ کسی نے پہلی دفعہ ایسی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لیے سرکار نے اس کی پوری تعلیم کے لیے اسکالرشپ کا اعلان کردیا تھا، اور کچھ نقد انعام بھی۔





فی الحال لڑکے سے ان سب کی ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ اپنے کسی رشتے دار کے یہاں مہمانی میں گیا ہوا تھا۔ اس سے ملاقات کو کسی اور دن پر ٹالنے کی کوشش کی گئی لیکن علیزہ اور ایان کی ضد کے آگے سب ڈھیر ہو گئے: "ہمارے سفر کی خوب صورتی ان سے ملاقات میں چھپی ہوئی ہے۔ جب تک ہماری ملاقات نہیں ہو گی ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

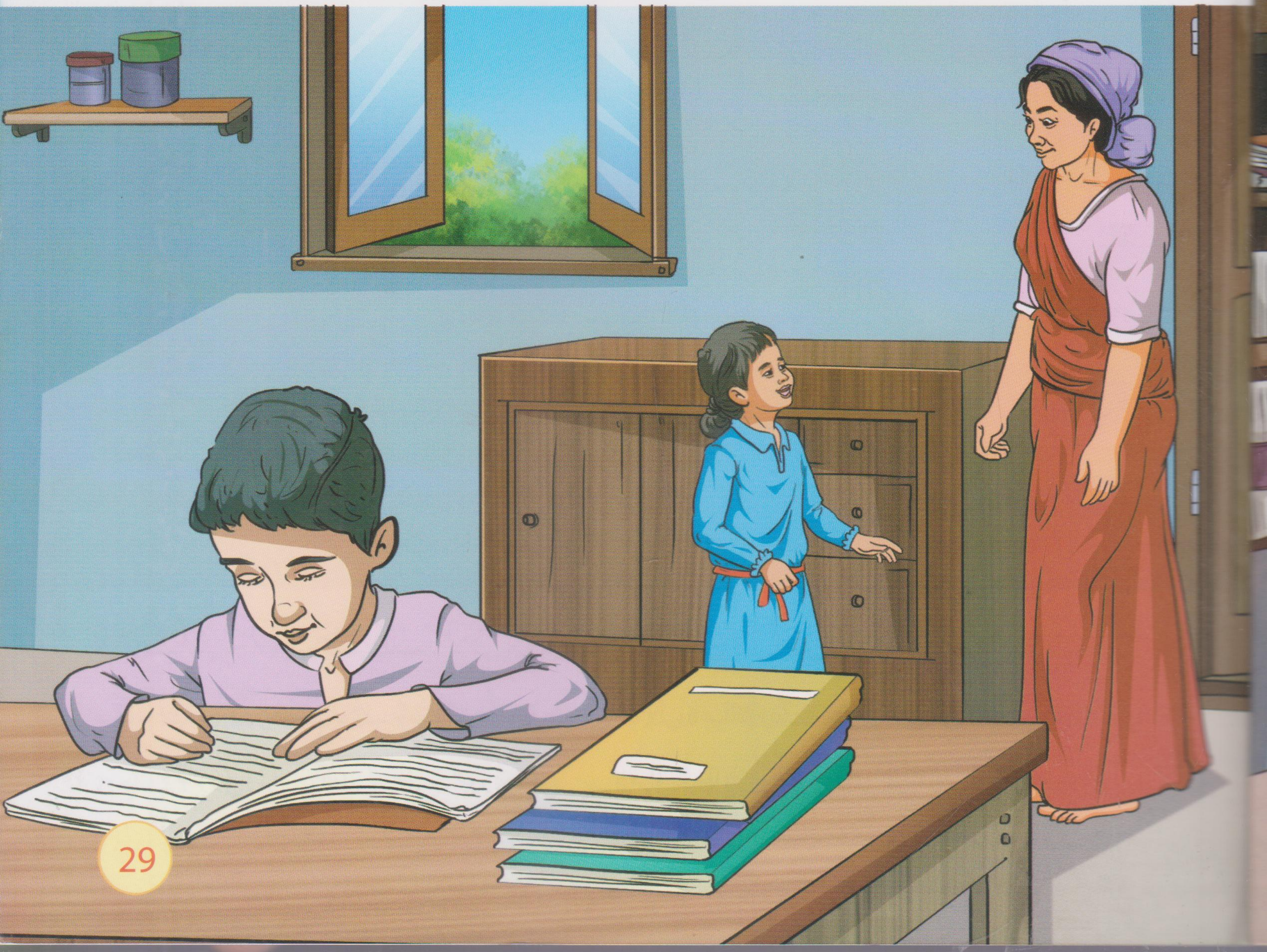


ابھی بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نے کار سنبھالی۔ وہ کامیاب لڑکے کو لانے نکلے۔ ادھر ایان اور علیزہ تصویر والے کمرے میں تھے اور ان کے والدین اسی روم میں بیٹھے تھے جہاں انھوں نے کچھ دیر پہلے کھانا کھایا تھا۔ آنٹی بچوں کے ساتھ تھیں۔ بچے ان سے جو پوچھتے تھے، وہ بتاتی جاتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس گھر میں ماں اور ایک بیٹا ہے۔ تین بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔

دو گھنٹے میں بچے اس گھر سے مانوس ہو گئے۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھی کتابوں کو وہ ٹٹولنے لگے۔ ان پر ہائی لائٹر کے نشانات تھے۔ اکثر کتابیں پرانی معلوم ہو رہی تھیں۔ کئی صفحات کٹے پھٹے تھے۔ انھوں نے من ہی من اپنی نئی کتابوں سے ان کتابوں کا موازنہ شروع کر دیا۔ کیونکہ ان کی کتابوں میں الفاظ چمکتے تھے مگر یہاں کی کتابیں بوسیدہ تھیں۔

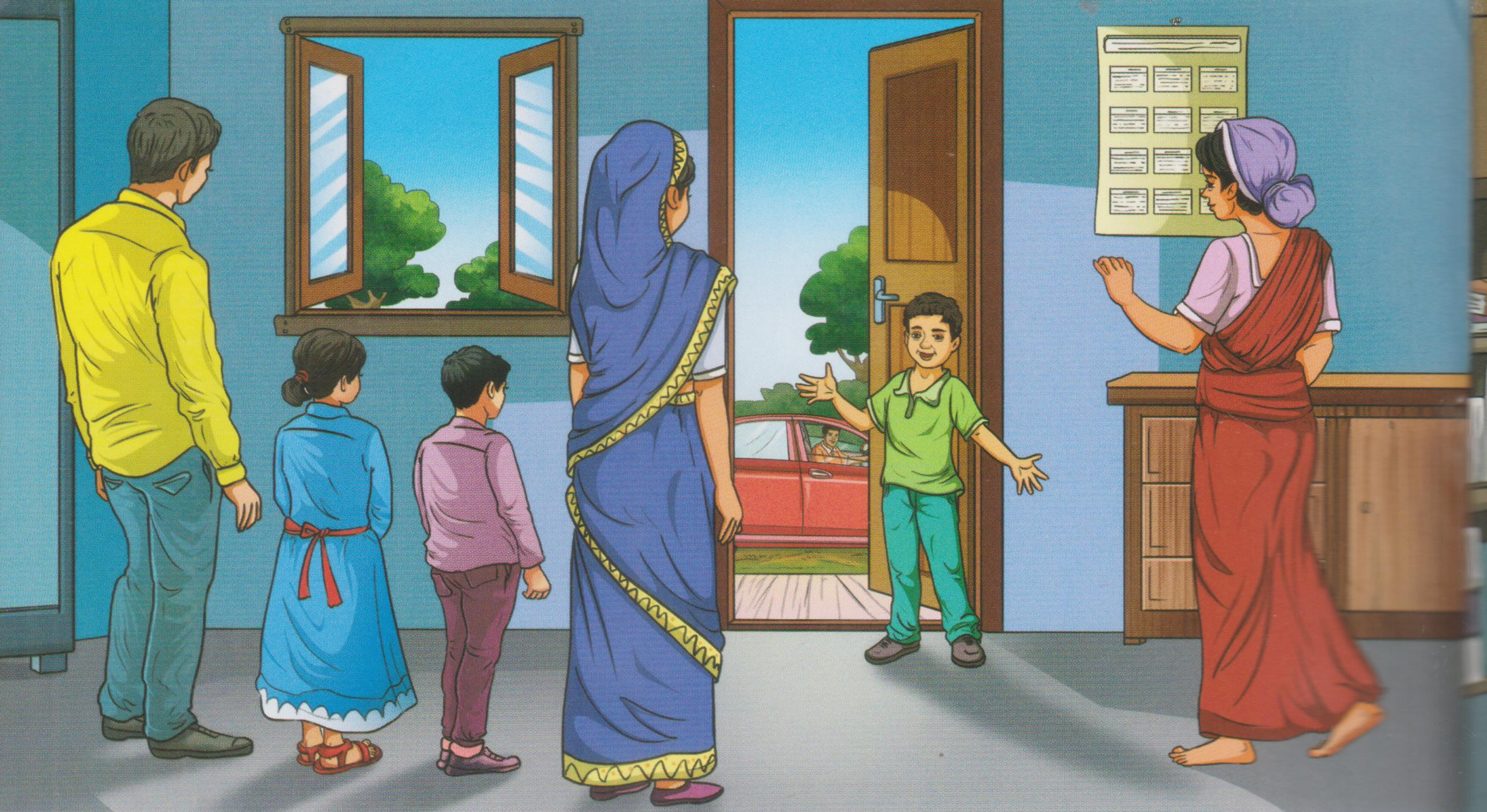


اب کتابوں کے ساتھ رکھی کاپیوں کے صفحات الٹنے کا دور آیا جس میں ہوم ورک کی روشنی پھیلی تھی۔ فارمولوں اور اصولوں کے مد نظر کثرت سے مشقیں کی گئی تھیں۔ کتابوں اور کاپیوں پر بکھری محنت نے ان کے دلوں میں لڑکے کے لیے اور زیادہ محبت جگادی تھی۔ اس لیے وہ دونوں ملنے کے احساس سے سرشار تھے۔ اسی درمیان علیزہ نے سوال کیا: ''آنٹی ٹاپر بننے کی کوئی دعا ہوتی ہے کیا۔''





یہ سن کر آنٹی مسکرائیں اور دیر تک مسکراتی چلی گئیں۔ ان کی مسکان کو آنکھوں میں بسائے بچے کمرے کو نہار رہے تھے۔ کتابوں کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انھیں محسوس ہوا کہ کتابوں کا ہر لفظ دعا ہے اور دعاؤں میں محنت کی آواز شامل ہو جائے تو پوری دنیا اس آواز کو سننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کامیابی آسمان سے برستی نہیں بلکہ کتابوں سے پھوٹتی ہے۔



اسی درمیان کار آگئی تھی۔ مہمانوں کے سامنے وہ لڑکا کھڑا تھا۔ علیزہ اور ایان کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کامیاب لڑکے کے پاس ہیں۔ سب اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ بہت کچھ پوچھ لینے کی تمنا جاگ اٹھی تھی مگر شاید بچوں کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ انھوں نے اس لڑکے کے ساتھ تھوڑا بہت دوبارہ کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ایک دوسرے کا مناسب تعارف ہوا۔ پھر کہنے سننے والی زبان حرکت میں آنے لگی۔ ڈھیر ساری گفتگو کے بعد لڑکے نے کہا:

میں چائے بگان میں کام کرنے والوں کے متعلق بہت کچھ سنتا تھا۔ یہاں کام کرنے والے بہت کچھ سناتے تھے، درد اور مصیبت کی کہانی! میں اپنے والد کو بھی محنت کرتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ بچے اور بچیوں کے مستقبل کے متعلق وہ فکر مند رہتے تھے۔ اس لیے میں سوچتا رہتا تھا۔

والد کی محنت مجھے ہمیشہ بیدار رکھتی تھی۔ اس لیے میں حوصلوں کو جمع کرتا رہتا تھا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے:

بے رنگ پانی کو چائے پتی رنگ دار کر دیتی ہے مگر خود اپنے بنانے والوں کی زندگی کو رنگین نہیں کر پاتی!

میں نے ایسے جملوں پر کبھی توجہ نہیں دی۔ حوصلہ توڑنے والی کسی بات کو میں نے خاطر میں نہیں لایا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ انجام دیکھتے ہیں اور آغاز سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ پتی بنیادی طور پر ہری ہوتی ہے اور اس سے زندگی میں ہریالی لائی جاسکتی ہے۔ میں نے زندگی کو پتی کے آخری مرحلے سے نہیں، اس کی شروعات سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس لیے میری سوچ و فکر میں ہریالی اتر آئی ہے، اور آنے والی زندگی بھی خوب صورت ہوگی۔ پھر میں نے کبھی کتابوں کے الفاظ کو سیاہ نہیں جانا، ہمیشہ انھیں ہرا تصور کیا ہے۔ جب الفاظ ہرے ہو جاتے ہیں تو زندگی کھل کھلا اٹھتی ہے۔





شام ڈھل گئی تھی۔ کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ باتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا تھا۔

جدائی کے وقت آنٹی کی آنکھیں نم تھیں اور دیگر افراد خاموش تھے۔ کسی گہری فکر میں ڈوبے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔

'چائے بگان کا کنول' ایک ایسی کہانی ہے جس میں نہ صرف آسانی تہذیب کو پیش کیا گیا ہے بلکہ بچوں میں محنت کے جذبے کو بھی ابھارا گیا ہے۔ انداز پیش کش میں مصنف نے بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے اس میں سیر و سیاحت کی اہمیت اور سوال کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی بچوں کی نفسیات اور تجسس کے پس منظر میں دلچسپ بن جاتی ہے۔



سلمان عبد الصمد

سلمان عبد الصمد نئی نسل کے فکشن نگار اور نقاد ہیں۔ فی الحال اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی، گلبرگہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقی کاوشوں میں ''لفظوں کا لہو''، ''متن کے آس پاس'' اور ''پیغام آفاقی'' مونوگراف وغیرہ شامل ہیں، جنھیں علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ سلمان عبد الصمد اردو افسانوں میں نفسیاتی رجحانات اور ان کے اسلوبیاتی مطالعے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ناول 'لفظوں کا لہو' پر انھیں ساہتیہ اکادمی یووا پرسکار 2019 مل چکا ہے۔

ISBN 978-93-49533-53-0

9 789349 533530

NCPUL | DELHI | INDIA

قیمت -/40 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، حکومت ہند، نئی دہلی
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی-110025